عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی!!

ادارہ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ماہنامہ غزالی

شوال المکرّم ۱۴۲۵ھ / دسمبر ۲۰۰۴ء

جلدسوم: شمارہ: ۴

فہرست

فی شمارہ: ۱۵ روپے سالانہ بدل اشتراک: ۱۸۰ روپے

خط وکتابت کا پتہ: مدیر ماہنامہ غزالی

مکان نمبر: P-12 یونیورسٹی کیمپس

پشاور

ای۔میل: saqi_pak@hotmail.com

حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ

انسان کی ضرورتیں (قسط:۲)

جہاد سب سے بڑا عمل ہے۔ اس میں کافروں کے ساتھ لڑائی ہوتی ہے لیکن اگر جہاد میں کسی کافر کو تو قتل نہ کرے اور اپنا سینہ سامنے کرے کہ کافر مجھے مار دے تو یہ شہادت نہیں ہوگی۔ جہاد اُس کو کہتے ہیں کہ آخر تک خوب جوش سے لڑو اگر مارتے ہوئے مر گئے تو شہید ہوگے۔ میدانِ جنگ میں بھی ہم مرنے کے لئے نہیں جاتے بلکہ مارنے کے لئے جاتے ہیں چنانچہ آیت میں فَیَقْتُلُوْنَ پہلے ہے اور بعد میں وَیُقْتَلُوْنَ ہے یعنی قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں۔ اسلام خودکشی کی اجازت نہیں دیتا۔ اُحد کا معرکہ ہے ایک شخص بے جگری سے لڑ رہا ہے، لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے ہیں کہ فلاں جنتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ دوزخی ہے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیچھے لگ گئے۔ جنگ میں اس شخص کو ایک زخم لگا، وہ زخم کا درد برداشت نہ کر سکا اور خنجر سے اپنے آپ کو قتل کر دیا۔ ہم مسائل کو اُلٹے رُخ سے حل کرتے ہیں کہ اگر فلاں نظام آ گیا تو مسائل حل ہو جائیں گے۔ میں نے ابتدا میں یہ کہا تھا کہ دین اسلام کو معمولی اور ناقص نہ سمجھو۔ کہیں تو سوشلزم کے پیچھے جاتے ہو اور کہیں کسی اور ازم کے پیچھے جاتے ہو۔ یہ مسجد ہے اور اس مسجد میں میں پورے ایمان و یقین کے ساتھ اور دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام سوشلزم نہیں ہے۔ اسلام کا اپنا نظام سیاست و معیشت ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی لینن، سٹالن اور اینجلز کے محتاج نہیں۔ جس کے پاس قرآن و حدیث ہو اسے کسی اور ازم اور فلسفہ کی ضرورت نہیں۔ تم اسلام کے نمائندے ہو کر دوسروں کی بزم کو روشن کرتے ہو۔

غنی روزِ سیاہ پیر کنعان را تماشا کن
که نور دیده اش روشن کند چشم زلیخا را

ترجمہ: اے غنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی مصیبت کے دنوں کو دیکھ کہ اس کی آنکھوں کا نور (یوسف علیہ السلام) زلیخا کی آنکھوں کو ٹھنڈا کر رہا ہے۔

تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا نور ہو۔ کہیں کسی نظام کو اپنا رہے ہو اور کہیں کسی نظام کو۔ تمہارے پاس لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا نظام ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام کو اپناؤ اور لعنت بھیجو دوسرے تمام نظاموں پر۔ تم تو دُنیا کے امام ہو۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تم سے کام دُنیا کی امامت کا

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

کیا سوچتے ہو اور باطل نظاموں کا مطالبہ کرتے ہو۔ خدا اور رسول کو پہچانو، کہاں جا رہے ہو۔ اپنے کو اور اپنے نفع ونقصان کو نہیں پہنچانتے، اپنے نظام کو نہیں پہچانتے کبھی کسی کے پہلو میں گرتے ہو اور کبھی کسی کے پہلو میں گرتے ہو۔ تم تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیدوں کے ستارے ہو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو چمکاؤ تو یہاں بھی چمک جاؤ گے اور آخرت میں بھی چمکو گے۔ ضروریات کے پورا کرنے کے لئے سیدھی راہ اختیار کرو۔ آپ کا بھی یہ ایمان ہے اور ہمارا بھی یہ ایمان ہے کہ جو کچھ بھی دُنیا میں ہے۔ یہ سب کا سب خدا کا ہے اور سب کچھ خدا کرتا ہے۔ اگر خدا سے تمہارا رابطہ اور تعلق قائم ہوجائے اور تم خدا سے یہ کہو کہ یہ کام میرے لئے کردے تو کیا خدا نہیں کرے گا؟ اگر تم اپنی ماں کے چہیتے اور لاڈلے ہو تو ماں سے اڑ کر کیا کچھ نہیں لے سکتے؟ ماں اپنے منہ کا لقمہ نکال کر بچہ کو دے دیتی ہے، اللہ تعالیٰ تو ماں سے کئی گُنا زیادہ شفقت کرنے والے ہیں۔ تم خدا کے ہو جاؤ، خدا سے مانگو اور خدا سے جملہ حاجات کو پورا کروالو۔ خدا کے ساتھ ہر چیز کا واسطہ اور رابطہ ہے۔ جب تم رابطہ اور تعلق قائم کرلو گے تو خدا ہر چیز کو حکم دے گا کہ میرے بندے کی حاجت کو پورا کرو۔

صحابہؓ کے لئے صحراؤں میں پانی کا بندوبست ہوا، جانوروں، درندوں اور چرندوں نے جنگلوں کو خالی کیا۔

حضرت عقبہ بن نافعؓ نے جب الجزائر فتح کیا تو وہاں پر قیروان میں چھاؤنی بنانا چاہتے تھے۔ جہاں چھاؤنی اور شہر بنانا تھا وہاں گھنا جنگل تھا جس میں ہر قسم کے جانور اور درندے تھے۔ حضرت عقبہ ابن نافع نے جنگل کے جانوروں کو پکارا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی اور غلام ہیں۔ ہم یہاں پر چھاؤنی بنانا چاہتے ہیں لہذا تم اتنی دیر میں اس جنگل کو خالی کردو ورنہ پھر ہم تم کو قتل کردیں گے۔ تمام جانوروں نے جنگل خالی کر دیا۔ بھیڑیوں، شیروں اور چیتوں نے اپنے بچوں کو منہ میں اُٹھا اُٹھا کر جنگل کو چھوڑ دیا۔ جب صحابہ اللہ پاک کی مان رہے تھے تو تمام مخلوقات ان کی مان رہی تھیں۔ ہم نے خدا کی ماننا چھوڑ دی تو اللہ کی مخلوق نے ہماری ماننا چھوڑ دی۔

دریائے نیل میں طغیانی نہیں آتی تھی۔ ٹیڑھے راستے والے (مصر کے کفار) کہتے تھے کہ اس میں طغیانی تب آئے گی جب اس میں ایک نوجوان عورت کو ڈالا جائے۔ جب مصر پر مسلمانوں کو حکومت ہوگئی تو دریا میں طغیانی نہیں آ رہی تھی۔ لوگوں نے زمانۂ جاہلیت کی رسم کے مطابق عورت ڈالنے کا ارادہ کیا۔ مصر کے گورنر حضرت عمرو ابن العاص نے منع کیا اور حضرت عمرؓ کو واقعہ کی اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے ایک رقعہ دریائے

نیل کے نام لکھا کہ اگر تو اللہ کے حکم سے بہتا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ تجھ کو چلا دے اور اگر اپنے حکم سے بہتا ہے تو پھر ہم کو تیری ضرورت نہیں ہے۔ وہ رقعہ دریا میں ڈالا گیا اور اس میں طغیانی آ گئی۔ اور اس دن سے آج تک بہہ رہا ہے۔

حضرت ضرارؓ بن ازور بہت بہادر اور دلیر تھے۔ میدانِ جنگ میں قمیص اتار کر لڑتے تھے اور ڈھال بھی نہیں لیتے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے نیزہ اور تلوار چلاتے تھے شہادت کے شوق میں اور اس بات کے انتظار میں۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یرموک کی جنگ میں ان کا گھوڑا زخمی ہو گیا۔ گھوڑے پر زین نہیں تھی گھوڑے کو تھپڑ لگا کر کہا کہ اگر تم نے بزدلی دکھائی تو کل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تیری شکایت کرونگا۔ گھوڑا رو دیا اور ایسا چست ہو گیا کہ جیسے جوان ہو گیا ہو اور جب تک جنگ ختم نہیں ہوئی لڑتا رہا اور جب جنگ ختم ہو گئی تو گر گیا۔

صحیح طریقہ کیا ہے، کہ خدا کے ساتھ تعلق کو جوڑو۔ ہر قدم اُٹھانے سے پہلے یہ دیکھو کہ اسلام میں یہ جائز ہے یا نہیں۔ ماننے کے قابل ہے خدا کی ذات اور اتباع کے لئے ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

تو کریمی و رسول تو کریم
ہزار شکر کہ ہستم میان دو کریم

ترجمہ: یا اللہ تو بھی کریم ہے اور تیرا رسول بھی کریم ہے، ہزار شکر کہ میں دو کریموں کے درمیان ہوں۔

بعض لوگوں کی ٹانگیں نہیں ہوتی ہیں تو وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتے ہیں۔ ہم بھی اسی طرح اور لوگوں کی بیساکھیوں کی مدد سے چلتے ہیں۔ جس کو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سہارا حاصل ہو وہ کس طرح خدا اور رسول کو چھوڑ کر دوسری طرف جا سکتا ہے۔ قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں میں نجات سمجھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ﴿هلموا الى عباد الله﴾ (میری طرف آؤ اے اللہ کے بندو۔)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئیں گے تو یہاں کے مسائل بھی حل ہوں گے اور ابدالاباد کے مسائل بھی حل ہوں گے۔ میرے دوستو! اپنے مقام کو سمجھو اور اس سے باخبر ہو جاؤ۔ خدا کے راستے پر آ جاؤ۔ یہ

تمہارے بننے کے دن ہیں۔دُنیا کی زندگی آخرت کے لئے دی گئی ہے۔کس سے بنوگے؟ خدا کے تعلق سے بنوگے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباعِ کامل سے بنوگے۔ یہ حقیقت اور احساس ہمارے دلوں کے اندر اُتر جائے کہ ہر قدم کو اُٹھانے سے پہلے خدا کو دیکھیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو دیکھیں۔آج جس گدھے نے آواز دی اس کے پیچھے ہو لئے۔حالانکہ سب سے بری آواز گدھے کی ہے۔

اِنَّ اَنۡکَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ ؀ (لقمن: ۱۹)

ترجمہ: بیشک آوازوں میں سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔

وہ تو خدا کی قسم حیوان ہے اور یہ انسان جو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو چھوڑ کر نئی آوازیں دے رہا ہے گدھوں سے زیادہ گدھا ہے۔آخر سوچو ہمارے دین اور طریقہ میں کس بات کی کمی ہے۔ جس دین کی تکمیل کی بشارت اللہ تعالیٰ نے دی ہے

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ (المائدہ:۳)

ترجمہ: آج کے تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔

یہ تکمیلِ دین ہر مسئلہ کے حل کو لئے ہوئے ہے۔دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہیں،سب کچھ اپنے گھر میں موجود ہے۔اگر سورج نکلا ہو اور کوئی موم بتی لیکر کتاب پڑھ رہا ہو تو کیا کروگے؟ سیدھے مینٹل ہسپتال پہنچاؤ گے۔اسی طرح اسلام کے سورج کے مقابلہ میں یہ جتنے بھی نظام ہیں ان کی مثال موم بتی کی بھی نہیں بلکہ یہ تو ظلمتیں ہیں۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سورج کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلے گا۔آزمائش کے لئے خدا نے مہلت دی ہے۔جب ان کی رسی کٹے گی تو معلوم نہیں کہاں گریں گے۔

فِیۡ مَکَانٍ سَحِیۡقٍ (الحج: ۳۱)

کسی دور دراز جگہ میں لے جائے گا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے سامنے کسی کا دین نہیں چلے گا۔

وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ؀ (صف:۸)

اللہ تعالیٰ اپنے نورِ ہدایت کو کامل کر کے رہے گا اگرچہ مشرکین اس کو پسند نہ کرتے ہوں۔

اگر اس نورِ ہدایت کو حاصل کرنے کے لئے ہماری جانیں بھی لگ جائیں تو سستا سودا ہے۔ اگر ہم کہیں کہ اللہ کی رضا کیلئے نکل جاؤ، اپنا اور لوگوں کا تعلق خدا کے ساتھ جوڑو، دین و دُنیا بن جائیں گے۔ کتنے عالم آگے درپیش ہیں۔ قبر حشر صراط اور ابدالاباد کی منازل آگے آنے والی ہیں۔ زندگی میں ایک دفعہ طے کرلو کہ وہ چابی جس کے ملنے سے تمام مسائل کے قفل کُھلیں گے اس کو حاصل کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کو حاصل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا حاصل کرنا مُشکل نہیں وہ رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ٥ (ق:١٦)

ہم انسان کے اسقدر قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ۔

جان درجسم است ،او درجان نہاں

اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں

ترجمہ: جان جسم میں ہے اور وہ جان میں چھپا ہوا ہے، اے وہ ہستی جو چھپے کے اندر چھپا ہے اور جان کی جان ہے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویریار جب ذرا گردن جُھکائی دیکھ لی

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اپنی آخرت، قبر اور موت کے مسئلے کو مرنے سے پہلے پہلے حل کرو۔ حل کے لئے طریقہ سیکھنا پڑے گا اور سیکھنے کے لئے اُستاد کے پاس جانا پڑے گا۔ اگر مُجھ سے کوئی پوچھے کہ الجبرا کا مسئلہ (ا+ب)۲ کیا ہے۔ اگر مُجھے نہ آتا ہو تو میں کیا حل بتاؤں گا؟ میں تو ایسا حل بتاؤں گا جیسے کسی نے ایک امام سے کہا کہ پیچھے مقتدی کمزور ہیں ہلکی نماز پڑھاؤ۔ اس نے ہلکی کو ہل کے سمجھا اور نماز میں خوب ہلنے لگا۔ اسی طرح اگر کسی اُستاد کے پاس نہیں جائیں گے تو بات نہیں بنے گی۔ اپنی اصلاح اور خدا اور رسول کے تعلق کے حصول کو اپنی نمبر ایک ضرورت سمجھو۔ اہل اللہ سے تعلق قائم کرو، موت کے وقت اور حشر ونشر کو نگاہ میں رکھو اور اس کے لئے کچھ کوشش کرو۔ اور زیادہ کوشش بھی نہ کرو صرف بلوغ سے لے کر موت تک کوشش کرو۔ جس عادت پر پڑ جاؤ گے اس میں پھر مزہ آئے گا۔ دین کو آسان بنانے کے لئے اتنی مشق کرو کہ عادت بن جائے بلکہ تمنا اور ارمان بن جائے۔ جب دین تمنا ارمان بن جائے گا۔ تو پھر اس پر قربان ہونا آسان ہوگا۔ اکثر لوگ جو سگریٹ پیتے ہیں پہلا سگریٹ خود اپنے پیسوں سے نہیں خریدا ہوگا۔ میں ایک دفعہ شہر سے بس میں یونیورسٹی آ رہا تھا ایک لڑکا بھی بس میں بیٹھا تھا۔ نئ

جوانی تھی، سگریٹ پی رہا تھا اور دھویں کو چکر دلا کر رنگ (Ring) بنا رہا تھا۔ ادھر اُدھر بھی دیکھتا تھا کہ لوگ مُجھ کو دیکھ رہے ہیں یا نہیں کہ میں کیسے کمال کر رہا ہوں اور دھویں کے بادل بنا رہا ہوں۔ اسی طرح دو تین دن صرف چکھنے کے طور پر پیتے ہیں پھر ایسی لت پڑ جاتی ہے کہ دل کو جلا دیتی ہے اور نوٹوں کو بھی جلا دیتی ہے۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ جب دل کو جلاتے ہو تو صحیح طریقہ پر جلاؤ، اللہ اللہ کرنے کا بھی ایک نشہ ہے۔ ایک دفعہ اللہ کہا ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ دوبارہ اللہ کہا۔ اللہ اللہ۔ یہ بھی ایک نشہ ہے۔ کبھی کس نعرہ کے پیچھے کبھی کس نعرہ کے پیچھے دوڑتے بھاگتے ہو۔ اللہ کے نعرہ کے پیچھے بھی بھاگو تا کہ دُنیا و آخرت میں کامیاب و سرخرو ہو جاؤ۔ آمین

☆☆☆☆☆

حضرت سید سلیمان ندویؒ کو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کے بعد جب ذکر جہری میں کیفیات و واردات محسوس ہونے لگیں تو ان ایّام میں یہ اشعار موزوں ہوئے۔

اے خوشا جذب محبت اے خوشا تاثیر عشق
گاہے گاہے ان کو میری یاد اب آنے لگی

نامۂ عرضِ محبت شوق سے پڑھنے لگے
خط سے کیا دل کے دھڑکنے کی صدا آنے لگی

میری وارستہ طبیعت مدح کے قابل ہوئی
اب میرے جوشِ جنوں کی بھی ادا بھانے لگی

نغمہ اللہ سے طبع حزیں موزوں ہوئی
جو کبھی گاتی نہ تھی اب وجد میں آنے لگی

جب سے اے دل اپنے عیبوں پر نظر اپنی پڑی
اپنے دعوائے ہنر سے شرم سی آنے لگی

۲۵ مئی ۱۹۴۲ء

☆☆☆☆☆

جب میت کو قبر میں رکھیں تو یہ دعا پڑھیں:

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَ فِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَ مِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى

قبرص میں چند روز

(پروفیسر ڈاکٹر اعجاز خٹک، خیبر میڈیکل کالج پشاور)

ایک طبی کانفرنس کے سلسلے میں قبرص جانے کا اتفاق ہوا۔قبرص ایک جزیرہ ہے جو کہ دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ایک پر ترکی کا قبضہ ہے اور دوسرا یونان کے زیر اثر ہے۔کانفرنس میں ایک خاتون ڈاکٹر سے تبادلہ خیال ہوا۔اس نے سوال کیا کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے جو حقوقِ انسانی کی خلاف ورزی ہے۔ میں نے یہ سوال سن کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ "اے اللہ میں ایک دنیادار اور کم علم انسان ہوں مگر تیرے پیارے حبیب صل اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہوں، میرے سینے کو کھول دے اور میری لاج رکھ لے"۔ یہ دعا پڑھنے کے بعد میں نے خاتون سے کہا کہ "کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" اس نے جواب دیا کہ "میں شادی شدہ تھی لیکن اب طلاق ہو چکی ہے"۔میں نے پوچھا "کیوں؟" خاتون نے کہا "میرا شوہر اولاد چاہتا تھا جبکہ میں طبی طور پر اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم تھی۔"

میں نے کہا "طلاق کیوں ہوئی؟"

خاتون نے کہا "کیونکہ میرا شوہر دوسری شادی کرنا چاہتا تھا اور بیک وقت ہمارے مذہب میں ایک شادی رکھی جاسکتی ہے۔"

میں نے کہا کہ "کیا تم دونوں ساتھ رہنا چاہتے تھے؟"

خاتون نے کہا کہ "ہاں، مگر مذہبی طور سے ایسا ممکن نہیں تھا۔"

میں نے خاتون کو کہا اس جواب میں تمہارے سوال کا جواب بھی ہے۔اسلام نے چار شادیوں کی اجازت اس لیے دی ہے کہ اگر کسی طبی معذوری کے حوالے سے میاں بیوی کو مسائل ہوں تو دوسری یا تیسری شادی کی جاسکتی ہے جبکہ آپ کے مذہب میں ساتھ چھوڑنا پڑتا ہے۔"

خاتون پر اس بات کا گہرا اثر ہوا۔پھر میں نے پوچھا "کیا آپ حضرت محمد صل اللہ علیہ وسلم کو مانتی ہیں؟" وہ خاموش رہی۔

میں نے کہا کہ دیکھو! اسلام ایک مکمل مذہب ہے۔ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا پیغمبر مانتے ہیں مگر حضرت محمد صل اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانتے ہیں۔خاتون پر اس بات کا گہرا اثر ہوا۔میں نے پھر اس کو چند اسلامی کتب ارسال کیں اور اس کے نتیجے میں وہ خاتون مسلمان ہوگئی۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد جب میں Larnca شہر آیا جہاں سے مجھے دوبئ کے لیے جہاز پکڑنا تھا تو جہاز میں ابھی سات گھنٹے تھے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ مجھے کسی مسجد کو لے چلو۔ ٹیکسی ڈرائیور جو کہ عیسائی تھا نے کہا کہ یہاں دو مسجدیں ہیں ایک نئی ہے جو کہ تین سو سال پرانی ہے اور ایک کئی سو سال پرانی ہے اور اس میں چند قبریں بھی ہیں لیکن وہ جنگل میں ہے اور کافی دور ہے۔ میں نے اسے کہا کہ جو کافی پرانی ہے اور جہاں قبریں بھی ہیں ادھر لے چلو۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد جب میں مسجد کے اندر جانے لگا تو ایک شخص نے دروازے پر میرا استقبال کیا اور کہا کہ "میں عیسائی ہوں اور حکومت نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ لوگوں کو گائیڈ کروں۔ یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے کہ علامہ اقبال کو مسجد قرطبہ میں گائیڈ کرنے والا بھی ایک عیسائی تھا۔ میں نے گائیڈ سے کہا کہ میں وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ میں نے ایک پرانے کنویں سے پانی نکالا، وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھی اور پھر گائیڈ سے کہا کہ مجھے قبریں دکھاؤ۔ وہ مجھے ایک قبر پر لے گیا جو مسجد کے احاطے میں تھی۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی حضرت ام حرام رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ مجھے جتنی قرآنی سورتیں یاد تھیں میں نے زور زور سے ان کی تلاوت کی، اس وقت جو کچھ میں نے محسوس کیا وہ لذت پھر نہیں ملی۔

پھر وہ ایک اور قبر پر لے گیا جو مسجد کے احاطے کے پاس تھی اور کہا کہ یہ اردن کے شاہ حسین کے دادا کی قبر ہے۔ یاد رہے کہ اردن کے شاہ حسین کا خاندان ہاشمی نسل سے ہے۔ پھر وہ ایک تیسری قبر پر لے گیا اور کہا کہ یہ اس مسجد کے پہلے اور آخری امام کی قبر ہے۔

اس رات جو کچھ خواب میں دیکھا وہ ایک اعزاز اور راز ہے مگر واپسی پر ڈاکٹر فدا صاحب سے یہ بیان کیا۔ ڈاکٹر فدا صاحب نے بحوالہ حکایات صحابہ (حضرت مولانا زکریاؒ) فرمایا کہ حضرت ام حرامؓ حضرت انسؓ کی خالہ تھیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے ان کے گھر تشریف لے جاتے اور کبھی دوپہر وغیرہ کو وہیں آرام بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر آرام فرما رہے تھے کہ مسکراتے ہوئے اٹھے۔ اُم حرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں کس بات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ مجھے دکھلائے گئے جو سمندر پر لڑائی کے ارادے سے اس طرح سوار ہوئے جیسے تختوں پر بادشاہ بیٹھے ہوں۔ ام حرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرما دیجئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ مجھے بھی ان میں شامل فرما دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا تم بھی ان میں شامل ہوگی اس کے بعد پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا اور پھر مسکراتے ہوئے اٹھے۔ام حرامؓ نے پھر مسکرانے کا سبب پوچھا آپؐ نے پھر اسی طرح ارشاد فرمایا۔ام حرامؓ نے پھر وہی درخواست کی کہ یا رسول اللہ آپ دعا فرماویں کہ میں بھی ان میں ہوں۔آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم پہلی جماعت میں ہوگی۔چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو شام کے حاکم تھے جزائر قبرص پر حملہ کرنے کی اجازت چاہی، حضرت عثمانؓ نے اجازت دے دی۔امیر معاویہؓ نے ایک لشکر کے ساتھ حملہ فرمایا جس میں ام حرامؓ بھی اپنے خاوند حضرت عبادہؓ کے ساتھ لشکر میں شریک ہوئیں اور واپسی پر ایک خچر پر سوار ہو رہی تھیں کہ وہ بِدکا اور یہ اس پر سے گر گئیں جس سے گردن ٹوٹ گئی اور انتقال فرما گئیں اور وہیں دفن کی گئیں۔اہلِ بیت اور اہل اللہ سے محبت ہی زندگی کا ثمر ہے۔بقول شاعر

لاکھ چاہا یہ حوادث نے کہ مٹ جائے جمیل　　نسبتِ آلِ محمدؐ نے یہ ہونے نہ دیا

☆☆☆☆☆☆☆

مسلمان کی پردہ پوشی:

اہل تصوف کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مخلوق خدا کی نہ صرف اصلاح کرتے ہیں بلکہ ان کے عیوب کی پردہ پوشی بھی فرماتے ہیں۔پرانے دور کے ایک بزرگ حضرت شاہ نعمت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا عمل اس کی ترجمانی کرتا ہے......''جب شہنشاہ جہانگیر نے مہابت خان کے صاحبزادے خانہ زاد خان کو بنگال کا گورنر مقرر کیا اور مہابت خان نے بیٹے کو حضرت سے راہنمائی کی تاکید کی تو اسی سلسلے میں ایک دن حضرت، خانہ زاد کی بارہ دری میں اسے ہدایت فرما رہے تھے کہ ایک فقیر آیا اور کہلا بھیجا کہ گورنر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں اور اپنا نام سید نعمت اللہ بتایا کیونکہ وہ فقیر جانتا تھا کہ سید صاحب سے گورنر کو بیحد عقیدت ہے لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ سید صاحب خود بھی اندر تشریف رکھتے ہیں۔گورنر نے جب اس فقیر کی مکاری سنی تو تو غضبناک ہوا لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ اسے اندر بلا لو ممکن ہے بیچارہ کسی ضرورت کے تحت غلط بیانی کر رہا ہو۔حضرت کے ارشاد پر فقیر کو بلوایا، حضرت تعظیماً کھڑے ہو گئے، اپنے برابر بٹھایا، نام پوچھا۔کہا سید نعمت اللہ شاہ۔حضرت نے کچھ اشارہ فرمایا، خان صاحب نے فوراً! دو صد روپے منگوا کر اس فقیر کو دیے اور وہ دعا دیتے ہوئے رخصت ہوا۔جس پر حضرت نے فرمایا کہ سب سے بڑی عبادت بندے کی عیب پوشی ہے۔'' (بحوالہ تصوف، اولیائے مانکی شریف اور تحریک پاکستان)

حضرت ڈاکٹر فدا محمد مدظلہٗ

تعلق مع اللہ کی نسبتیں

جاننا چاہئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ ذوالجلال کے ساتھ بندوں کا تعلق دورخوں کا ہوتا ہے صوفیائے محققین ایک تعلق کو نسبتِ ولایت کہتے ہیں اور دوسرے تعلق کو نسبتِ نبوت کہتے ہیں۔ نسبتِ ولایت والا تعلق اقویٰ اقرب اور احلیٰ (زیادہ مضبوط، زیادہ قریب اور زیادہ میٹھا) ہے بمقابلہ نسبتِ نبوت والے تعلق کے۔ اس بات سے ظاہری نظر والوں کو بڑا خوف محسوس ہوگا کہ اس طرح تو اولیاء کا درجہ انبیاء سے بڑھایا جارہا ہے۔ بات ایسے نہیں بلکہ ہر نبی کو نسبتِ ولایت اور نسبتِ نبوت دونوں نسبتیں اپنے اپنے درجے کے مطابق پوری قوت کے ساتھ حاصل ہوتی ہیں۔

نسبتِ ولایت:

نسبتِ ولایت انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذاتی وانفرادی تعلق کو کہتے ہیں جس میں سب سے کٹ کٹا کر اور چھٹ چھٹا کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہوجانا ہوتا ہے، وَ تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا (اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ رہو) اس حالت میں اللہ کے غیر کی طرف متوجہ ہونا اور اللہ کے غیر میں مشغول ہونا انسان کے لیے ایک مجاہدہ ہوتا ہے۔ اس نسبت والے لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انفرادی اعمال بصورتِ ذکر ،تلاوت، نوافل، مراقبہ واعتکاف میں مصروف رہتے ہیں۔ ان اعمال میں ان کو بہت ہی زیادہ لطف وکیفیات بصورتِ رقتِ قلبی (دل کی نرمی)، گریہ وصیحہ (رونا دھونا اور چیخ وپکار) حاصل ہوتے ہیں۔ ذاتِ ذوالجلال کی یاد اور ان کے ساتھ تنہا ہونا ان کے دل کا ارمان اور چاہت ہوجاتی ہے۔ تعلق مع الانام (لوگوں کا تعلق) سے ان کو وحشت ہوتی ہے۔ بعضے اولیاء اللہ کی ساری عمر اسی نسبت کے انہماک میں گزری ہے، حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابراھیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ، علاؤالدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ اس رُخ کی شخصیات گزری ہیں۔

نسبتِ نبوت:

نسبتِ نبوت عوام الناس میں اشاعتِ دین کی کوششوں سے عبارت ہے جس میں تدریس، تعلیم، تبلیغ، جہاد وقتال اور قضا وسیاست شامل ہیں۔ ان باتوں کو انبیاء علیھم السلام اور ان کے نائبین بامرِ الٰہی سرانجام دیتے ہیں۔ اس میں گویا مشاہدہ الٰہی براہ راست نہیں ہے بلکہ بذریعۂ مرأۃ خلق (مخلوق کے آئینے سے) ہے

۔چنانچہ نسبتِ ولایت اقرب اور احلیٰ ہے تو نسبتِ نبوت اصعب (مشکل) اور اثقل (بوجھ والی) ہے۔ چنانچہ انبیاء علیھم الصلوۃ السلام کے لیے نسبت ولایت کے براہ راست مشاہدہ سے ہٹ کر مشاہدہ بذریعہ مرأۃ خلق کی طرف متوجہ ہونا مجاہدہ ہوتا ہے۔ بہر حال چونکہ عوام میں اصلاح کا کام کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے اس لیے ذاتِ ذوالجلال سے دوری کا مجاہدہ برداشت کرتے ہوئے وہ اس کام کو کرتے ہیں اور جوں اس سے فارغ ہو جائیں تو براہ راست مشاہدہ بصورت اعمال انفرادیہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ o وَاِلیٰ رَبِّکَ فَارْغَبْ o (الانشراح:۶،۷)

ترجمہ: تو آپ جب (تبلیغ احکام سے) فارغ ہو جایا کریں تو (دوسری عبادات متعلقہ بذاتِ خاص میں) محنت کیا کیجئے۔(بیان القرآن)

یعنی جب خلق کے سمجھانے سے فراغت پائے تو خلوت میں بیٹھ کر محنت کرتا کہ مزید یُسر کا سبب بنے اور اپنے رب کی طرف (بلا واسطہ) متوجہ ہو۔(تفسیر عثمانی)

حضورِ اقدس صل اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے مبلغ، سب سے بڑے مدرس اور سب سے بڑے مربی ہیں آپ کی فکر سارے عالم کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے اور یہ فکر آپ کو فکر کے درجے سے بڑھ کر غم اور کڑھن بلکہ دکھ اور درد کی حد تک حاصل ہے جس کے بارے میں قرآن پاک کی آیت

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ النَّفْسَکَ عَلٰی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا (الکھف:۶)

ترجمہ: (اور آپ جو ان پر اتنا غم کھاتے ہیں) سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے۔

لیکن اس سب بات کے باوجود آپ اسی فکر میں پڑ کر وَاِلیٰ رَبِّکَ فَارْغَبْ والے مطالبہ سے فارغ نہیں ہوئے۔ رات کے وقت نماز کا اتنا طویل قیام جس میں چھ چھ پارے کی ایک رکعت کا بھی تذکرہ ہے اور پاؤں مبارک کے ورم سے پھول جانے کا اور پھٹ جانے کا بھی تذکرہ ہے۔ اس سارے مضمون کو لکھنے کے بعد ایک خاص بات کی طرف توجہ دلانی مقصود تھی وہ یہ ہے کہ دین کا کام کرنے والے جو دین کے مختلف شعبوں میں مشغول ہیں بعض اوقات ان شعبوں میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ اپنی ذات کی فکر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اپنے شعبوں کے کاموں کو نبھاتے ہوئے کچھ اوقات میں سب سے تنہا ہو کر انفرادی اعمال کے ذریعے قرب الٰہی میں کوشش کرنے کے الیٰ ربک فارغب والے مطالبے سے غافل ہو جاتے ہیں۔

بلکہ اس میں محققین نے یہ بات لکھی ہے کہ جس آدمی کا عوام الناس میں اختلاط کرتے ہوئے تو بہت دل لگ رہا ہو اور اپنی ذات سے تنہائی میں انفرادی اعمال کے ذریعے قرب الٰہی کی کوشش میں دل نہ لگ رہا ہو تو اس میں اس بات کا خطرہ ہے کہ اشاعت دین کے کام کہیں تقریر کی شعلہ بیانی، درس کی روانی، تحریر کی جولانی کی خاطر نہ ہو رہے ہوں نیز امیر، ناظم اور مہتمم بننے کے ذریعے جذبۂ جاہ کے لیے تو نہیں ہو رہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم الصلوٰہ السلام کو تو نسبت ولایت سے نسبت نبوت تک منتقل ہوتے ہوئے مجاہدہ محسوس ہوتا ہے لہٰذا اگر ہمیں اس کے برعکس محسوس ہو رہا ہو تو یہ بات متفکر کرنے والی ہے۔

عام طور پر چونکہ اشاعت دین کے کاموں کا زیادہ فائدہ سامنے آرہا ہوتا ہے اس لیے اسی کی طرف زیادہ متوجہ ہو کر دوسری طرف نظر انداز ہو جاتی ہے اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک تو بیٹری کا چارج ہونا ہے اور ایک اس کا استعمال ہونا ہے، فائدہ تو استعمال ہوتے ہوئے ہی نظر آتا ہے لیکن استعمال تو تب ہی ہوگی جب چارج ہوگی لہٰذا جتنا اہم استعمال ہے اتنا ہی اہم چارج ہونا بھی ہے۔

مشائخ کاملین کی سوانح عمریاں پڑھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی زندگی انتہائی عوامی ہوتی ہے در و دربان کی پابندیوں سے فارغ ہوتے ہیں شاہ و گدا کسی کے لیے روک ٹوک نہیں ہوتی لیکن اوقات خلوت کو حاصل کرنے کے لیے در و دربان کی پابندیاں وہ بھی کرتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر اپنے باطن کا حال ہی درست نہیں رہتا تو دوسرے کو کیا فائدہ پہنچائیں گے۔ جلوت کے ساتھ خلوت نہ ہو تو اس بات کا خطرہ ہوتا ہے کہ بیٹری کو کم اور ڈِم کرتے کرتے کہیں جلوت مکمل مردہ (ڈسچارج) ہی نہ کر لے۔ چنانچہ حضرت عبدالقادر رائے پوریؒ کی سوانح میں اس خلوت کا خاص تذکرہ ہے۔ بندہ مارچ ۱۹۸۰ء (۱۴۰۰ھ) میں اپنے شیخ اوّل حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب کی خدمت میں اپنے شیخ ثانی حضرت مولانا محمد اشرف صاحب کے ہمراہ دہلی حاضر ہوا تو حضرت جی کے خدام نے فرمایا کہ حضرت مغرب تا عشاء اپنے حجرے میں بند ہوتے ہیں اور نوافل میں سوا پارہ پڑھتے ہیں اور اس وقت میں کسی سے ملاقات نہیں فرماتے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک گھنٹہ عمومی ملاقات فرماتے تھے۔

سلاسل سے منسلک سالکین کو پانچ نمازوں کے علاوہ چار اوقات ایسے ہیں کہ ان کی پابندی کرنی چاہئے اور ان میں انفرادی اعمال میں خوب دل لگا کر اور جان تھکا کر کام کرنا چاہئے۔ ان چار اوقات کے قرآن وحدیث میں بہت فضائل آئے ہوئے ہیں۔ وہ چار اوقات آدھی رات کے بعد صبح تک، نماز فجر سے

نماز اشراق تک، عصر سے مغرب تک اور مغرب سے عشاء تک ہیں۔ان چار کی پابندی اگر ممکن نہ ہو تو کم از کم تہجد کے علاوہ ایک مزید وقت ضرور اس کے لیے فارغ کرنا چاہئے۔

ایک عام شکایت جو دین کا کام کرنے والوں کی طرف سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انفرادی اعمال تہجد، تسبیح، تلاوت کے لیے وقت نہیں ملتا یا مارے تھکاوٹ کے اٹھنا اور ان کاموں میں لگنا بوجھل محسوس ہوتا ہے۔دراصل کام کرنے کے لیے تو پیٹ اور پیٹھ کو ہلکا رکھنا ہوتا ہے۔پیٹ کو ہلکا رکھنا تو بسیار خوری سے پرہیز کرنے سے حاصل ہوتا ہے، ضرورت سے زیادہ نہ کھایا جائے اگرچہ اتنا کم بھی نہ کیا جائے جس سے کمزوری ہو جائے۔پیٹھ کو ہلکا رکھنا غیر ضروری اور لایعنی تعلقات اور کاموں سے اپنے آپ کو بچانے سے حاصل ہوتا ہے۔اس سلسلے میں عوام الناس سے تعلق کے شعبے پر غور کرنا ہوگا کہ کتنا تعلق اشد ضروری ہے اور کتنا تعلق محض تفریح طبع، گپ شپ، مجلس آرائی کی نذر رہے۔نذر ہونے والے وقت کو تو بچانا انتہائی ضروری ہے اسی بات سے تو باطن میں سستی اور غفلت طاری ہوتی ہے۔عام ملاقاتوں کے بارے میں یہ عرض ہے کہ جب دو آدمی آپس میں ملتے ہیں تو دونوں کے باطن کا حال ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے اور اپنے اعمال کے بقدر نور و ظلمت ایک دوسرے کی طرف منتقل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اس انتقال میں بھی بیٹری والا قانون چلتا ہے جس بیٹری کی بجلی زیادہ قوت میں ہو (High Voltage) اس سے کم قوت والی بیٹری کی طرف بجلی کا بہاؤ (current flow) شروع ہو جاتا ہے۔چنانچہ اگر ظلمت والے کی قوت زیادہ ہے تو اس سے ظلمت قلب پر آئے گی جس سے باطن میں ضعف، غفلت اور بے ہمتی طاری ہو جاتی ہے۔اب اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔بندہ کا کچھ وقت سلسلہ عالیہ نقشبندیہ والوں کے ساتھ بیٹھنا ہوا ان کی یہ ہدایت ہوا کرتی تھی کہ راستہ چلتے ہوئے سر پر ایسا کپڑا ڈال کر چلنا چاہئے جس سے صرف اتنا راستہ نظر آئے جتنا ضرورت ہے اور دائیں بائیں نگاہ متوجہ نہ ہو تا کہ باطن میں فالتو خیالات ہی داخل نہ ہوں کیونکہ فالتو نظارے اور فالتو خیالات باطن میں داخل ہو کر اندر ایک تصورات کی ریل چلا کر یکسوئی اور سکون کو درہم برہم (Shatter) کر دیتے ہیں۔اور بقول حضرت حکیم الامت مجدد الملّت تھانویؒ یکسوئی کے بغیر یک سوئی بھی نہیں یعنی ایک سوئی کے بقدر بھی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔لہذا اپنے اوقات اور اپنے باطن کی بہت زیادہ حفاظت کرنے کی ضرورت ہے۔

پیٹھ کو ہلکا رکھنے میں اسباب معیشت میں بھی بقدر ضرورت لگنا ہوتا ہے فالتو جنجال اپنے ذمے نہیں لینا ہوتا، اپنے

کام سے کام رکھنا، ہر کسی کے مسئلے میں اپنے آپ کو الجھانے سے بچانا، برادری کے مسائل اور جھگڑے جو اشد درجہ کی ضرورت کے تحت اپنے ذمے نہ ہوں ان سے اپنے آپ کو دور رکھنا یکسوئی حاصل کرنے کے راز ہیں۔ اوقات طعام و آرام کی پابندی اس سلسلے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ حال درست نہ ہو رہا ہو تو کاملین کی صحبت میں رہ کر یا حضرات انبیائے علیہم السلام، صحابۂ کرام اور اولیائے عظام کے تذکروں کو انہماک سے پڑھ کر باطن کو دھونے کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حضرت ڈاکٹر فدا محمد مدظلہٗ

اعتکاف رمضان کی کارگزاری

امسال ۱۴۲۵ھ بمطابق نومبر ۲۰۰۴ء سلسلے کا سولہواں اعتکاف مدینہ مسجد میں ہوا۔ تقریباً پچاس آدمی مسلسل عشرہ رہے، باقی حضرات ایک دن، دو دن، تین دن یا ہفتہ بھر قیام کرتے رہے۔ افطار کی مجلس میں تقریباً ایک سو پچاس آدمی شامل ہوتے رہے۔ سحری کے وقت ساٹھ ستر ساتھی ہوتے تھے۔ تراویح میں دو ختم قرآن، دن کو گیارہ تا ایک بجے تربیتی مجلس ہوتی رہی۔ نمازِ عصر کے بعد تعلیم کا حلقہ ہوتا رہا جس میں تذکرۃ الاولیاء، (حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ) تنبیہ الغافلین (حضرت فقیہہ ابولیث ثمرقندیؒ)، حکایات صحابہ (حضرت مولانا زکریاؒ)، صحابہ کرام کے جنگی کارنامے (علامہ واقدی) میں سے پڑھا جاتا رہا۔ تراویح کے بعد حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ کے مضامینِ سیرت اور العطور المجموعہ میں سے پڑھا جاتا رہا۔ اختتام اعتکاف پر مولوی ڈاکٹر عبید اللہ صاحب میڈیکل آفیسر محکمۂ صحت کو چاروں سلسلوں میں خلافت دی گئی۔

عبید اللہ صاحب خیبر میڈیکل کالج میں پانچ سال بندہ کے شاگرد رہے۔ حضرت مولانا محمد اشرف صاحب کے صحبت یافتہ، حضرت مولانا الیاسؒ دہلوی کی تحریک میں چار مہینے لگائے ہوئے ہیں۔ درسِ نظامی میں مولانا محمد امین دوست صاحب کے شاگرد ہیں۔ تقریباً پندرہ سال سے بندہ سے بیعت تھے، سلسلے کے سارے پروگراموں میں پوری پابندی کے ساتھ شامل ہوتے رہے اور انفرادی طور پر علم و ذکر کی محنت میں لگے رہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو سلسلے کا فیض پھیلنے کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

ماخوذ از خطبات حکیم الامت

حقانیت اسلام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کے متعلق ارشاد ہے ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ یعنی اگر آپؐ بدگو اور سخت ہوتے تو کوئی بھی آپؐ کے پاس نہ پھٹکتا، سب ادھر ادھر بھاگ جاتے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ آپؐ کے پاس مسلمانوں کا بہت اجتماع تھا تو معلوم ہوا کہ آپؐ بدگو اور سخت نہ تھے جیسا کہ تاریخ سے بخوبی ثابت ہے اور یہ وجہ ہے اجتماع کی۔ حیرت ہے کہ آجکل بعض لوگ تاریخ کو بھی نہیں دیکھتے اور بیدھڑک کہہ دیتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا۔ اس کا جواب مولانا محمد قاسم صاحب نے خوب دیا تھا کہ شمشیر کے لیے شمشیر زن کہاں سے آئے تھے؟ اگر وہ شمشیر زن بھی بزورِ شمشیر آئے تھے تو یہ سلسلہ تسلسل کو مستلزم ہے، لامحالہ کہنا پڑے گا کہ شمشیر زنوں میں اسلام بلا زور شمشیر آیا تھا۔ اور جب کچھ لوگوں میں اسلام بلا زورِ شمشیر آیا تو اوروں میں اس طرح آنے سے کون سی چیز مانع ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا۔ اسلام تو اصلاح کے لیے اور تلوار رفعِ شر (شر دور کرنے) کے لیے ہے۔ جہاد سے اشاعت اسلام مقصود نہیں بلکہ حفاظت اسلام مقصود ہے۔ لوگ ان دونوں میں فرق نہیں سمجھتے اس لیے خواہ مخواہ اعتراض کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی بابت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اسلام بزور شمشیر پھیلایا ان کے حالات دیکھئے تو معلوم ہو کہ اسلام تلوار سے پھیلایا یا اپنی پاکیزہ تعلیم سے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کے سردار تھے، ایک جنگ میں عیسائیوں سے عارضی صلح ہوئی۔ ایامِ صلح میں لشکرِ اسلام کے سپاہی کے ہاتھوں ان کے بادشاہ کی تصویر کی آنکھ پھوٹ گئی، عیسائیوں کو سخت ناگوار ہوا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ اس وقت تو مسلمانوں کا پلہ ہر طرح سے غالب تھا، یہ ممکن تھا کہ ساعت بھی نہ کرتے بلکہ اس تصویر کو اکھاڑ کر پھینک دیتے۔ مگر اسلامی تعلیم کا اثر دیکھئے کہ انھوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور کہا کہ ہم نے قصداً ایسا نہیں کیا اور ہم اس کا بدلہ دینے کو تیار ہیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ کھڑے ہو گئے کہ اس تصویر کے بدلے تم میری آنکھ پھوڑ لو، بس فوراً ہی مخالفوں کی گردنیں جھک گئیں یہ اخلاق تھے جنھوں نے اسلام کو پھیلایا۔ میں کہتا ہوں کہ تلوار کے زور سے اگر اسلام پھیلایا بھی جائے اور بزور کسی کو مسلمان بھی کیا جائے تو اس کا اسلام ایسا ہونا چاہئے کہ تلوار ہٹتے ہی ندارد ہو جائے۔ وہ کونسی چیز تھی جو تلوار ہٹنے کے بعد بھی اسلام کو قلوب میں برقرار رکھتی تھی؟ وہ اسلام کی حقّانیت ہی تھی کہ ایک دفعہ کلمہ پڑھنے کے بعد جان جاتی رہے مگر اسلام نہیں چھوٹ سکتا اور پھیلانے کا ذریعہ اخلاق تھے۔ جس کا نمونہ مولانا مظفر حسین صاحب (حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ کے آباء واجداد میں سے

بڑے پائے کے عالم اور بزرگ گزرے ہیں) کے بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔انہی بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ راستے میں ایک بڈھے کو دیکھا کہ بوجھ سر پر لیے ہوئے آرہا ہے اور تھک گیا ہے۔آپ سے رہا نہ گیا اور اس سے کہہ سن کر اس کا بوجھ اپنے سر پر رکھ لیا حالانکہ خود بھی جوان نہ تھے۔اس نے کہا کہ میاں جی تم بھی بڈھے ہی ہو۔کہا کہ میں اوّل تو تجھ سے کم بڈھا ہوں دوسرے تازہ دم ہوں۔اس کا بوجھ لیے دور تک چلے گئے اور اس سے باتیں کرتے رہے۔اس نے کہا کہ میں مولوی مظفر حسین سے ملنے کا بہت مشتاق ہوں ،سنا ہے کہ وہ آجکل ادھر آئے ہوئے ہیں ،انھوں نے کہا کہ ہاں میں ان سے ملا دوں گا۔یہاں تک کہ جب اس کے گاؤں میں پہنچ گئے وہاں پہنچ کر پھر اس نے کہا کہ بھائی یاد رکھو مجھ کو مولوی مظفر حسین سے ضرور ملا ئیو۔اس وقت فرمایا کہ مظفر حسین تو میں ہی ہوں۔وہ نہایت شرمندہ ہوا اور ان کے قدموں میں لوٹنے لگا۔مولانا نے کہا کہ بھائی شرمندگی کی کیا بات ہے،ایک مسلمان کا کام کر دیا تو کیا ہوگیا۔

اورانہی مولانا کی حکایت ہے جو بالکل اس کی مصداق ہے۔

شنیدم که مردان راه خدا　　　　دل دشمناں ہم نکردند تنگ

ترا کے میسر شود ایں مقام　　　　که با دوستانت خلاف است و جنگ

سنا ہے کہ مردان راہِ خدا　　　　نہ کرتے تھے دل دشمنوں کا بھی تنگ

تجھے ہو میسر کہاں یہ مقام　　　　کہ ہے دوستوں سے خلاف اور جنگ

(میں نے سنا ہے کہ مردان راہ خدا نے دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ نہیں کیا ہے۔تجھ کو یہ مرتبہ کہاں حاصل ہوسکتا ہے جبکہ تیری تو دوستوں کے ساتھ بھی لڑائی اور مخالفت ہے)

ایک قصبہ ہے بیڈولی۔کسی سفر میں مولانا وہاں پہنچے اور سرائے میں ٹھہرے۔وہاں ایک مہاجن بھی مع اپنے لڑکے کے ٹھہرا ہوا تھا۔لڑکے کے ہاتھ میں سونے کے کڑے تھے۔اس نے مولانا سے سب پتہ وغیرہ پوچھا جیسے مسافر آپس میں پوچھتے ہیں کہ آپ کہاں سے آئے اور کہاں جائیں گے؟ مولانا نے فرمایا کہ میں صبح کو فلاں جگہ جاؤں گا۔چنانچہ مولانا شب کو تہجد پڑھ کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوگئے۔اس بنئے کی جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا تو لڑکے کے ہاتھ میں کڑے ندارد۔حضرت مولانا نہایت غریبانہ حالت میں تھے،بنئے نے خیال کیا کہ ضرور وہی غریب سا آدمی جو یہاں ٹھہرا ہوا تھا کڑے اتار کر لے گیا۔اس نے پتہ تو مولانا سے پوچھ ہی لیا تھا،بس اٹھ کر سیدھا اس طرف ہولیا۔مولانا جا ہی رہے تھے کہ بنئے نے آواز دی۔حضرت نے فرمایا

بھائی کیوں کیا ہے؟ اس نے پاس جا کر ایک گھونسا لگایا اور کہا کڑے لے کر چلے آئے اور کہتے ہیں کیا ہے، چلو تھانہ کو۔ اس پر حضرت نے (اپنے آپ سے) جی میں کہا کہ تو کیوں ایسی حالت میں رہتا ہے جو اس کا تیری طرف ایسا خیال ہوا، تیرا علاج یہی ہے۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ بھائی چل۔ چنانچہ چلتے چلتے جھنجانہ کے قریب آئے۔ تھانہ آبادی کے باہر تھا۔ تھانہ دار مولانا کا معتقد تھا جوں حضرت مولاناؒ کو دور سے دیکھا سروقد تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اب تو بنیا گھبرایا اور سمجھا کہ یہ کوئی بڑے آدمی ہیں۔ مولانا نے فرمایا ڈرومت میں تجھے کچھ نہ کہنے دوں گا۔ چنانچہ تھانیدار نے اس کی جب خبر لینا چاہی تو مولانا نے کہا اگر اس سے کچھ بھی کہو گے تو مجھے سخت تکلیف ہو گی اور بنیے سے کہہ دیا بھاگ جا بھاگ جا۔ پھر مولانا فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس واقعہ سے بڑا نفع ہوا، جب لوگ مجھ سے مصافحہ کرتے ہیں اور ہاتھ چومتے ہیں تو میں خیال کرتا ہوں کہ مظفر حسین! اللہ پاک کا تجھ پر بڑا افضل ہے کہ تجھے ان لوگوں کی نظر میں معزز بنا دیا ہے ورنہ تیری حیثیت تو وہی ہے جو اس بنیے کی نظر میں تھی۔

یہ ہیں اخلاق اہل اللہ کے اور یہ ہے تواضع کہ دل دشمناں هم نکردند تنگ (دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ نہیں کیا) کتاب میں تو پڑھا ہی ہوگا مگر یہ اس کی نظیریں اس زمانہ تک موجود ہیں۔

☆☆☆☆☆

(بقیہ صفحہ "۱۸" سے) حضور کی کیفیت کا دوام بھی کم خوش قسمتوں کو نصیب ہوتا ہے۔ حضرت والاؒ نے ایک صاحب کو لکھا، "جس قدر بھی حضور نصیب ہو وہ شکر کے قابل ہے دوامِ حضور کم کسی کو نصیب ہوتا ہے۔"

لیکن اس کمی سے سالک کو ہمت پست نہ کرنا چاہیئے اور استقامت سے اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے، جو کچھ عطا ہو اس پر شکر ادا کرنا چاہیئے، لیکن بعض بندگانِ خدا ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں قرب و حضور کی دائمی دولت نصیب ہوتی ہے۔ حضرت شیخ قدس سرہ ایک گرامی نامے میں کسی طالب کو ارقام فرماتے ہیں۔

"دائمی حضوری بھی انشاء اللہ تعالیٰ کبھی حاصل ہو گی لیکن اس وقت بھی جو کچھ حاصل ہو جاتی ہے شکر کے قابل ہے، شکر سے نعمت کی زیادتی ہوتی ہے۔" (بحوالہ سلوک سلیمانی۔ حضرت مولانا محمد اشرفؒ)

☆☆☆☆☆

اخلاص کی نشانی یہ ہے کہ اگر اسی کام کو دوسرے جائز طریقے سے کوئی کرنے لگے تو خوشی ہو کہ ہمارا ہاتھ بٹایا۔ اور اگر گرانی ہو اور ناگواری ہو کہ یہ دوسرے طریقے پر کام کیوں شروع ہو گیا تو یہ عدم اخلاص کی نشانی ہے۔ (تبلیغ دین)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے: ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود الحارث بن غافل بن حبیب بن شمخ بن فار بن مخزوم بن صاہلہ بن کاہل بن الحارث ابن تمیم بن سعد بن ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر الہذ لی المکی۔

دعوت حق کے بالکل ابتدائی دنوں کی بات ہے، پیغمبر علیہ السلام اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مکہ معظّمہ سے باہر جنگل تشریف لے گئے۔ پھرتے پھراتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیاس محسوس ہوئی، لیکن پانی دور دور نہ تھا۔ قریب ہی ایک نوعمر چرواہا بکریاں چرا رہا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا ''لڑکے! کیا تم کسی بکری کا دودھ نکال کر ہماری پیاس نہ بجھا سکو گے؟''

چھوٹے سے قد اور گندمی رنگ کے اس دبلے پتلے چرواہے نے جواب دیا۔ ''صاحبو! یہ بکری میری نہیں ہے، اس کا مالک عقبہ بن ابی معیط (مکہ کا مشہور مشرک) ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر امانت میں خیانت ہوگی۔''

پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا: ''اچھا کوئی ایسی ہی لاؤ جو بے دودھ کی ہو (یا جس نے بچہ نہ دیا ہو)۔ چرواہے نے کہا ''ویسی تو ہے مگر یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کس کام کی ہے؟''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم لاؤ تو سہی۔'' چرواہے نے ایک بکری پیش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھن پر ہاتھ پھیر کر دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً تھن کو دودھ سے بھر دیا۔ پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس سے اتنا دودھ نکالا کہ تینوں نے سیراب ہو کر پیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے تھن خشک ہو کر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

نوجوان چرواہا اس نظارے سے حیران رہ گیا۔ پیغمبر علیہ السلام سے آج ملنے کا پہلا ہی اتفاق تھا۔ یہ معجزہ دیکھ کر اس کا دل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عقیدت سے معمور ہو گیا۔ شہر پہنچ کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور ایک دن خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر عرض کیا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بھی اپنی جماعت میں داخل فرما لیجیے۔''

پیغمبر علیہ السلام نے اس کے سر پر دست شفقت پھیر کر فرمایا: **اِنَّکَ غُلَامٌ مُعَلَّمٌ** (تم تعلیم یافتہ لڑکے ہو۔)

اِنَّکَ غُلَامٌ مُعَلَّمٌ کے خطاب یافتہ خوش نصیب نوجوان، حضرت عبداللہ بن مسود رضی اللہ عنہ

تھے۔

آپؓ کے والد نے چونکہ اسلام کا زمانہ نہیں پایا تھا، ان کی والدہ کا نام ام عبد تھا۔ پیغمبر علیہ السلام اکثر ان کی والدہ کی نسبت سے ''ابن ام عبد'' ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

شرف اسلام سے مشرف ہونے کے بعد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خود کو پیغمبر علیہ السلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ساتھ ہی نہایت ذوق وشوق سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں لگ گئے۔ آپ احد السابقین میں ہیں۔ بقول بعض آپ کا نمبر چھٹا تھا۔ اس وقت تک چند ہی سیعد الفطرت ہستیاں مشرف بہ اسلام ہوئی تھیں اور قریش کے قہر وغضب اور شدائد ومصائب کا نشانہ بنی ہوئی تھیں۔ بلند آواز سے قرآن کریم کی تلاوت مشکل تھی۔

سب سے پہلے مکہ میں قرآن مجید بالجہر پڑھنے والے آپؓ ہیں۔ اس کا واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک دن باہم مشورہ ہوا کہ قریش کے سامنے بلند آواز سے کلامِ الٰہی پڑھا جائے، اسکی کیا صورت ہو۔ نوجوان ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کام کے لئے فوراً ہی خود کو پیش کر دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ یہ کام پُر خطر ہے، تمہارا کوئی طاقتور قبیلہ بھی نہیں کسی مصیبت میں مبتلا ہوئے تو ان مشرکین کے پنجۂ ستم سے کون نجات دلا سکے گا؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، یہ کام مجھے کرنے دو، میرا آسرا اللہ پر ہے اور وہی میرا محافظ ہے۔ دوسرے دن طلوعِ آفتاب کے بعد جب تمام مشرکین ایک جگہ جمع تھے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مقامِ ابراھیم کے پاس ان کے سامنے نہایت بلند آواز سے قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ مشرکین اس نامانوس کلام کو سن کر حیران ہوئے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ یہ تو وہ کتاب پڑھی جارہی ہے جو محمد صل اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔ بس کیا تھا، سب ابن مسعودؓ پر ٹوٹ پڑے۔ انہیں اس قدر مارا کہ چہرہ متورم ہوگیا، جسم سے خون بہنے لگا مگر واہ رے جوش ایمانی کہ پٹتے جاتے تھے اور قرآن پڑھتے جاتے تھے۔ اس وقت تک تلاوت جاری رہی جب تک اتنا پڑھ کر ختم نہ کر لیا جتنا پڑھنا تھا۔

جب آپ خستہ حال، صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا ہم کو اسی بات کا خدشہ تھا، اسی لیے ہم روکتے تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بخدا مشرکین میری نظر میں آج سے زیادہ ذلیل کبھی نہیں ہوئے۔ میں پھر کل کلام الٰہی سناؤں گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، نہیں اب ضرورت نہیں، جو چیز انہیں ناگوار تھی تم نے اسے ان کانوں تک پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔

جب مشرکین کے مظالم بہت بڑھ گئے تو حضور صل اللہ علیہ وسلم نے انہیں حبشہ ہجرت کی ہدایت فرمائی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے تعمیل ارشاد میں دوبار ہجرت کی اور تیسری بار ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مدینہ منورہ میں آپ کی مواخاۃ حضور صل اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے کرادی۔

۲ہجری میں جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے شروع سے آخر تک ہر غزوہ میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ غزوۂ بدر میں جب ابوجہل کو دو انصاری نوعمروں نے شدید زخمی کر دیا تو اتفاق سے تعمیل ارشاد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ابوجہل کو تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچ گئے۔ ابوجہل اس وقت دم توڑ رہا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے سینے پر سوار ہو کر اسکی داڑھی پکڑ کر کہنے لگے ''دشمنِ خدا! تو ہی ابوجہل ہے، خدا نے تجھے خوب ذلیل کیا''۔ ابوجہل نے کہا ''کاش مجھے کسی کسان نے قتل نہ کیا ہوتا''۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ ابوجہل نے کہا ''او بھیڑ چرانے والے تو بہت اونچی جگہ چڑھا ہے۔ اتنا تو بتا کہ فتح کس کی ہوئی ہے'' آپؓ نے جواب دیا ''دشمن خدا! اللہ اور اس کے رسول صل اللہ علیہ وسلم کی''۔ یہ سن کر ابوجہل بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس کا سر کاٹ کر حضور صل اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا۔ حضور صل اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کے ناپاک سر کی طرف دیکھ کر فرمایا ''**اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَخْزَاکَ یَاعَدُوَّ اللّٰہِ** '' پھر فرمایا ''**مَاتَ فِرْعَوْنُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ**'' اس امت کا فرعون مر گیا۔

۸ہجری میں غزوہ حنین میں جب ایک موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک مختصر سی جماعت حضور صل اللہ علیہ وسلم کے گرد جاں نثاری کے جوہر دکھا رہی تھی۔ تو اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ، علی مرتضی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

۱۱ہجری میں حضور صل اللہ علیہ وسلم کے وصال سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا اور دل شکستگی میں گوشہ نشین ہو گئے۔ لیکن چند سال بعد ۱۵ہجری میں جنگ یرموک کے موقع پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ترغیب پر حضرت ابن مسعود رضی للہ عنہ اپنے گوشہ تنہائی سے نکل کر اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے اور بڑی ہی ثابت قدمی سے دادِ شجاعت دی۔ اس جہاد سے واپسی کے بعد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ

عنہ نے آپ کو کوفہ کا قاضی مقرر کرنے کے ساتھ بیت المال اور تعلیم کے شعبے بھی ان کے سپرد کیے۔ اس وقت اہل کوفہ کے نام جو تحریر آپ نے ارسال فرمائی وہ یہ تھی **وقد اثرتکم بعبد اللّٰہ بن مسعود علی نفسی** یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی شخصیت تو ایسی ہے کہ میں خود اپنے پاس رکھتا، میں نے انہیں تمہارے پاس بھیج کر بڑے ایثار سے کام لیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے دس سال کوفہ میں رہ کر اپنے فرائض ایسے خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ کوفہ کو علم سے بھر دیا۔

۳۲ ہجری میں بعمر تریسٹھ سال آپ کا انتقال ہوا۔ اسی زمانے میں ایک شخص نے ان سے خواب بیان کیا کہ آپ رضی اللہ عنہ حضور صل اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہیں اور حضور صل اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں، ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) میرے بعد تمہیں تکلیف پہنچی، آؤ میرے پاس چلے آؤ۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کیا واقعی تم نے یہ خواب دیکھا ہے، اس نے کہا ہاں، تو فرمایا کہ بس میرا وقتِ آخر آ پہنچا، شاید تم میرے جنازہ میں شریک ہو کر ہی مدینہ سے باہر جاؤ گے۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ صاحب فراش ہو گئے۔ اس درمیان آپ کے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مابین تعلقات کشیدہ تھے، جب علالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ دوران عیادت دونوں حضرات کے درمیان درج ذیل گفتگو ہوئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: آپ کو بیماری ہے؟

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ: اپنے گناہوں کی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ: ہاں خدا کی رحمت کی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: آپ کے لیے معالج بھیجوں؟

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ: معالج ہی نے مجھے صاحب فراش کیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: آپ کا وظیفہ جاری کر دوں؟

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ: مجھے اس کی حاجت نہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: آپ کی بچیوں کے کام آئے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ: آپ میری بچیوں کی عسرت اور احتیاج کی فکر نہ کریں۔ میں نے

انہیں تلقین کر دی ہے کہ ہر شب کو سونے سے پہلے سورۂ واقعہ کی تلاوت کرلیا کریں، کیونکہ میں نے پیغمبر علیہ السلام سے سنا ہے کہ جو شخص ہر رات سونے سے پہلے سورۂ واقعہ پڑھ لے گا وہ کبھی عسرت اور فاقہ میں مبتلا نہ ہوگا۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ اس گفتگو کے بعد دونوں بزرگوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف ہوگئے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم یمن سے مدینہ آئے تو ہم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو پیغمبر علیہ السلام کے پاس اس کثرت سے آتے جاتے دیکھا کہ ہم مدت تک یہی گمان کرتے رہے کہ وہ حضور صل اللہ علیہ وسلم کے گھر کے فرد ہیں۔ (ترمذی شریف، ج۲، صفحہ۲۲۲)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پیغمبر علیہ السلام کے خدّام خاص میں تھے۔ حضور صل اللہ علیہ وسلم کا بستر بچھاتے، تہہ کرتے، مسواک لاکر پیش کرتے، حضور صل اللہ علیہ وسلم کو وضو کراتے، آپ صل اللہ علیہ وسلم کی سواری کی باگ تھامتے ''صاحب النعل، صاحب الوسادہ، صاحب المطہرۃ'' کے القاب سے مشہور ہوگئے تھے۔ (بخاری شریف، جلد نمبر ۱ صفحہ ۵۳۱)

حضور صل اللہ علیہ وسلم کے نزدیک آپؓ کی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ٹانگیں بہت پتلی تھیں۔ وہ انہیں چھپائے رکھتے تھے۔ ایک دن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضور صل اللہ علیہ وسلم کے لیے مسواک توڑنے کے لیے پیلو کے درخت پر چڑھے، ان کی پتلی پتلی ٹانگیں دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہنسنے لگے، حضور صل اللہ علیہ وسلم کو ان کی ہنسی پسند نہ آئی اور فرمایا: ''تم ابن ام عبد کی ٹانگوں پر ہنستے ہو، یہی ٹانگیں حشر کے دن میزان عدل میں کوہِ اُحد سے بھی زیادہ بھاری ہوں گی۔''

آپؓ ان چند فاضل صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے جنہیں حضور صل اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کریم کا سب سے بڑا عالم تسلیم کیا جاتا ہے۔ خود بطور تحدیث نعمت کے فرمایا کرتے تھے کہ میں نے قرآن کریم کی ستر سورتیں خاص پیغمبر علیہ السلام کی زبان مبارک سے سن کر یاد کی تھیں اور قرآن کی ہر آیت کے بارے میں مجھے علم ہے کہ وہ کہاں نازل ہوئی اور اس کی شان نزول کیا تھی۔ بخاری شریف میں حضور صل اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے کہ قرآن ان چار آدمیوں سے سیکھو، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے۔ (ج۲، صفحہ ۵۳۱، ترمذی، ج۲، صفحہ ۲۲۲) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ آپ کے تبحر علمی کے بہت قدر دان تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے ''کُنَیفٌ مُلِئَ عِلمًا'' یعنی علم سے بھرا ہوا ایک ظرف ہیں۔ آپؓ نہایت پرسوز آواز کے مالک اور خوش الحان قاری بھی تھے، قرآن کی تلاوت کرتے تو در و دیوار وجد میں آجاتے۔

ایک بار پیغمبر علیہ السلام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد میں تشریف لائے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اندازِ تلاوت سے اس قدر مسرور ہوئے کہ نماز سے فارغ ہوکر فرمایا: **اِسْئَلْ تُعْطَهْ، اِسْئَلْ تُعْطَهْ**. یعنی جو سوال کرو پورا کیا جائے گا۔ جو سوال کرو پورا کیا جائے ۔ پھر ارشاد فرمایا: ''جو شخص چاہتا ہے کہ قرآن کو اسی طرح تر و تازہ پڑھنا سیکھے جس طرح وہ نازل ہوا ہے تو وہ ابن ام عبد کی قرأ پڑھے۔''

ایک بار آپؓ سے حضور صل اللہ علیہ وسلم نے سورہ نساء سنانے کی فرمائش کی۔ جب آپ نے شروع کیا اور اس آیت پر پہنچے **فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا** (نساء آیت نمبر ۴۱) سو اس وقت بھی کیا حال ہوگا جبکہ ہم ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے حاضر لائیں گے۔ تو شدت تاثر سے حضور صل اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پیغمبر علیہ السلام کی احادیث بیان کرنے میں غایت درجہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، ہمہ وقت یہ خوف دامن گیر رہتا تھا کہ بیان حدیث کے وقت ایسا کوئی لفظ نہ نکل جائے جو حضور صل اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمایا ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی احتیاط کا عالم یہ ہوتا تھا'' **قال قال رسول** '' کے الفاظ زبان سے نکالنے سے حتی الوسع احتراز کرتے تھے۔ اگر کبھی نکل جاتے تو جسم پر کپکپی طاری ہوجاتی، اور فرماتے حضور صل اللہ علیہ وسلم نے اس طرح یا اس سے کچھ زیادہ یا اسی کے ہم معنی الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔

مشہور تابعی حضرت عمرو بن میمونؒ فرماتے ہیں کہ ایک سال تک ہر جمعرات کو میرا معمول تھا، میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسب فیض کرتا، اس پوری مدّت میں اتفاق سے صرف ایک مرتبہ ''**قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**'' کا فقرہ نکل گیا، اس وقت ان کے بدن پر رعشہ طاری ہوگیا ماتھے پر پسینہ آگیا، رگیں پھول گئیں اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

مگر اس سب احتیاط و خوف کے باوجود حضور صل اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو امت تک پہنچانا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپؓ سے تقریباً آٹھ سو اڑتالیس احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے چونسٹھ متفق علیہ ہیں۔ اکتالیس میں بخاری اور پینتیس میں مسلم منفرد ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا شمار فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کے طبقہ مکثر ین میں ہوتا ہے۔ سات صحابہ کبار رضی اللہ عنہم اس طبقہ میں داخل ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، ان سب میں سے چار یعنی ابن مسعود رضی اللہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ موجودہ فقہ اسلامی کے بیشتر حصے کی بنیاد انہی کے فتاویٰ پر قائم ہوئی اور یہ فقیہ الامت کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ

اور آراء یوں تو سبھی فقہی مسالک کے نزدیک بڑے وزن اور اہمیت کے حامل ہیں، لیکن فقہ حنفی کا تو تمام تر دارومدار انہیں پر ہے۔ سبب یہ ہوا کہ آپ کوفہ میں باقاعدہ فقہ کی تعلیم دیتے تھے اور آپؓ کے شاگرد فتاویٰ کو لکھ لیتے تھے۔ بقول علامہ ابن قیمؒ: یہ خصوصیت صرف آپ کی تھی۔ آپ کے سوا کسی صحابی کے تلامذہ نے ان کے فتاویٰ اور مذاہبِ فقہ کو نہیں لکھا۔ فقہ واجتہاد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تین نامور شاگردوں نے زیادہ شہرت پائی۔ علقمہؒ بن قیس نخعی، اسود بن یزید نخعی، مسروق بن عبدالرحمٰن (اجدع) ہمدانی۔ ان میں سے علقمہؒ بطور خاص ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیثوں کے سب سے بڑے عالم تھے۔ علقمہؒ کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے اور خاص شاگرد ابراہیم بن یزید نخعیؒ نے ان کی مسند کو رونق بخشی۔ پھر ابراہیمؒ کے فتاویٰ کے سب سے بڑے عالم حضرت حمادؒ تھے، جن سے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے تعلیم پائی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نماز جماعت کے ساتھ وقت پر پڑھنے کے سخت پابند تھے۔ ایک بار والئی کوفہ ولید بن عقبہ کو مسجد پہنچنے میں دیر ہوگئی، آپؓ نے ان کا انتظار کئے بغیر وقت پر نماز پڑھا دی۔ ولید نے برہم ہوکر ان سے جواب طلبی کی تو فرمایا ''اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ تم اپنے کاموں میں مصروف رہو اور لوگ نماز میں تمہارا انتظار کرتے رہیں۔''

اپنے گوناگوں محاسن اخلاق اور تبحر علمی کی بدولت وہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے عبقری مردم شناس کے نزدیک اس قدر قدر ومنزلت کے حامل تھے کہ وہ ان کی ادنیٰ سی توہین بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ ایک بار حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو تہہ بند ٹخنوں سے نیچا ہونے پر ٹوکا۔ اس نے جواباً کہا ''ابن مسعود تم تہہ بند اوپر کرکے باندھو۔'' انہوں نے فرمایا ''بھائی میں معذور ہوں، کیونکہ میری ٹانگیں بہت پتلی ہیں۔'' فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ سنا تو اس شخص کو بلا کر درے لگوائے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت سے منہ زوری کی۔

سیدنا حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ آسمانِ فضائل ومناقب کے مہر عالمتاب تھے۔ سبقت فی الاسلام، تحمل شدائد، حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، شوق جہاد، شغف قرآن، تبحر علم، زہد واتقاء، حلم وانکسار، صبر واستغناء اور تفقہ فی الدّین ان کے صحیفہ حیات کے نمایاں ابواب ہیں۔ **رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عن کل الصحابۃ اجمعین.**

(بحوالہ کاتبین وحی: ابوالحسن اعظمی)

☆☆☆☆☆

حضرت سید ابوالحسن ندویؒ

اصول واخلاق پر مصالح ومنافع کی ترجیح

ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو مسلمانوں کی ذہنیت ونفسانیت میں اس پچاس سال کے اندر واقع ہوئی ہے کہ آخرت پر ایمان عملاً کمزور ہوتا چلا جارہا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر صداقت کے مقابلے میں منافع ومصالح، آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہوگیا ہے۔ اس سے مسلمان ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے ایک بے اصول جماعت کی سطح پر آتے جارہے ہیں، جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع ومصالح اور اغراض ومقاصد ہیں۔ یہ تبدیلی اس وقت شروع ہوئی جب ہندستان میں اور تقریباً تمام اسلامی ممالک میں (جو کسی طرح یورپ کے زیر اثر آئے) مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفہ اخلاق اور مغربی معیاروں کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ مغربی اخلاق، فلسفہ، علوم اور سیاست کا ہر طالب علم اور اس زمانے کا ہر واقف آدمی جانتا ہے کہ یورپ کا سارا نظامِ زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے "افادیت" اور "مصلحت بینی" اس نظام زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کرچکی ہے، سارا یورپ اس وقت سے جب سے اس نے کلیسا کے اقتدار سے اپنے کو آزاد کرایا، صرف ایک ہی مذہب رکھتا ہے (جس کے خلاف کسی گوشہ میں بھی عملاً کوئی بغاوت نہیں) اور وہ مذہب مادہ پرستی ہے۔ مسلم ممالک میں اس نظام کے غلبہ کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آخرت کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بعض حلقوں میں (جہاں یہ نظام اپنی پوری روح کے ساتھ مستولی ہے) معدوم ہوگئی ہے، دنیاوی ترقی اور مادی فوائد ومنافع منتہائے نظر بن گئے ہیں، اصولی واخلاقی معیار فوائد کے مقابلے میں اپنی اہمیت بالکل کھوچکے ہیں۔ مسلمانوں میں اس کے علمبرداروں نے ترقی (یعنی دنیاوی ترقی) پر اتنا زور دیا اور شدومد اور بلند آہنگی سے مادی ترقی کی دعوت دی کہ بالارادہ یا بلاارادہ آخرت اور امور آخرت کی اہمیت کم ہوگئی بلکہ بعض اوقات انہوں نے اس نظام اور ان افکار کی تضحیک وتنقیض کی جس میں دنیا کے مقابلے میں آخرت کی اہمیت زیادہ تسلیم کی گئی تھی اور مسلمانوں کو دنیا پرست اور آخرت سے غافل ہونے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی، ان جملوں اور ان تقریروں کا مذاق اڑایا گیا اور ان کی ہجو کی گئی جن میں دنیا کو متاعِ قلیل اور متاع غرور کہا گیا تھا۔ دنیا پرست اور مادہ پرست اور منکرِ آخرت قوموں اور ملکوں کو مسلمان نوجوانوں کے سامنے ایک بلند نمونہ اور معیارِ کامل کے طور پر پیش کیا گیا جو ہر تنقید سے بالاتر تھا۔ پھر جو نظام تعلیم قائم کیا گیا اس میں انکارِ آخرت کی روح بسی ہوئی تھی ،اس کی اساس اصول واخلاق کے مقابلے میں ظاہری منافع کی ترجیح پر رکھی گئی تھی، اس میں شرافت اور اخلاق

کے مقابلے میں خواہش نفس اور لذت کا عنصر غالب تھا، جو سرتا پا منکر آخرت تھی۔ دراصل یہ کسی مجرّد نظامِ تعلیم کی قبولیت کی دعوت نہ تھی اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ یہ ایک پوری تہذیب، تمدن، معاشرت، اخلاق اور فلسفۂ اجتماع کی دعوت تھی۔

پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ انہوں نے مسلمانوں کو صاف صاف ہوا کے رخ پر چلنے اور دریا کے بہتے ہوئے دھارے پر کشتی چھوڑ دینے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا کہ

''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی''

''زمانه باتو نسا زد، توبازمانه بساز''

اور اس دعوت میں مسلمانوں کی بہترین قابلیتیں صرف ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نظروں میں اصول و اخلاق کی اہمیت بتدریج گھٹتی چلی گئی اور بڑی تعداد میں ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس کے نزدیک اخلاق و مصالح میں کوئی تقابل نہ تھا اور ہر موقع پر مصالح کو اصول پر ترجیح حاصل تھی، وہ ہر وقت بڑے بڑے مذہبی اصول، شرعی حکم، اخلاقی تعلیم کو ایک شخصی منفعت یا قومی مصلحت پر قربان کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاص قسم کی محدود معاشی ترقی کے ساتھ ایک عام اخلاقی انحطاط اور بے اصولی پھیلی، بیسویں صدی کے اس نصف اوّل میں ہندستان میں ہمیں مسلمانوں کے کیریکٹر میں پہلے کے مقابلے میں نمایاں اور محسوس انحطاط نظر آ رہا ہے جو ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لئے حد درجہ تشویش ناک ہے۔ اب ایک اصول اور مذہبی اعتقاد کے مقابلے میں ذاتی یا شخصی فوائد کی قربانی کی مثال کم سے کم نظر آتی ہے، وہ بھی زمانہ گزشتہ کی یادگاریں ہیں جو برابر روبہ زوال ہیں۔ اب تمام مسائلِ زندگی پر ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا طریق فکر اور زاویہ نگاہ خالص مادہ پرستانہ اور تاجرانہ ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کام میں اس کے لیے کتنی مالی منفعت ہے یا اس کو کس قدر جاہ و اعزاز حاصل ہوگا، اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ وہ شرعاً اس کے لیے جائز اور اخلاقاً مستحسن ہے یا نہیں بلکہ اس کا اپنا ضمیر بھی اس سے مطمئن ہے یا نہیں۔ یہ سوالات مسلمانوں کے دماغوں سے ایک عرصہ سے بالکل نکلتے جا رہے ہیں یا ان کی اہمیت بالکل کم ہو گئی ہے اور ان کی بناء پر کسی مسلمان کو کسی عہدہ یا منفعت یا اعزاز کے قبول کرنے میں قلب و ضمیر کی رکاوٹ کم سے کم پیش آتی ہے، خواہ وہ شریعت میں مطلقاً حرام اور اخلاقاً حد درجہ معیوب ہو اور اس کا ضمیر ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اب اس کو ایک قومی خدمت سمجھا جاتا ہے اور اس طریقہ پر مال کسی فرد کی جیب میں آتا ہے اور اس کے بچوں اور متعلقین کی

خوش حالی کا سبب بنتا ہے وہ گویا قومی فنڈ میں جمع ہوتا ہے، اس لئے کہ سب مسلمان کی خوش حالی یا چند افراد کی خوش حالی خواہ وہ کسی قدر ذلّت اور احکام مذہبی کی صریح مخالفت کے بعد ہی حاصل ہو قومی خوش حالی کے مترادف ہے۔ اس ذہنیت و سیرت اور اس عام اخلاقی انحطاط اور کیریکٹر کی کمزوری کا اثر مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر پڑ رہا ہے اور افسوسناک بات یہ ہے کہ انکو اس میں کس قسم کا عیب نظر نہیں آتا بلکہ اس پر بحث کی گنجائش بھی بہت کم رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہ عام بے اصولی، تناقص اور اخلاقی کمزوریاں ہیں جن کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ ہمارے مسلمان اخبار و رسائل میں (الا ماشاء اللہ) ہر قسم کا خلاف تہذیب اشتہار شائع کرایا جاسکتا ہے اگر اس کی قیمت ادا کردی جائے، ادبی بے حیائی اور اخلاقی بے نظمی کی ہر تحریک کے لئے وہ آلہ بن سکتے ہیں، بدتر سے بدتر فواحش کی اشاعت ان کے ذریعہ سے کی جاسکتی ہے۔ اگر ان کو اس راستے سے اپنے رسالے کی کامیابی اور مقبولیت کا ایک فیصد بھی امکان نظر آئے تو ایسی صورت میں وہ اس کی ہرگز پروانہ کریں گے کہ ان کی اس حرکت سے خلق خدا کی اخلاقی ابتری اور انحطاط کا ۹۹ فیصد امکان ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ان اخبارات و رسائل کے مالک، ایڈیٹر ذاتی طور پر شریف مسلمان ہوں اور وہ اصولاً ان چیزوں کو درست نہ سمجھتے ہوں لیکن آپ اگر اس مسئلے پر ان سے گفتگو کریں گے تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ تجارت و صحافت میں اصول مذہب اور اخلاق کی پابندی نہیں کی جاسکتی۔

جب سے مسلمانوں پر مغربی طرز کی قومیت کا غلبہ ہوا ہے وہ ہر چیز کو قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے ہیں اور جن چیزوں کا ارتکاب وہ ذاتی سربلندی اور شخصی منفعت کے لئے کرتے تھے اب اس کو قومی مفاد کے لئے ضروری سمجھنے لگے ہیں مثلاً اب ان کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ تمام محکموں اور شعبوں میں ان کا تناسب قائم رہے۔ خواہ وہ آب کاری کا محکمہ ہو یا جاسوسی کا، سودی کاروبار کے نظام ہوں یا فی سبیل الشیطان لڑنے والے نظام، غضب یہ ہے کہ وہ کام بھی جس کی حرمت مسلمانوں کے لئے قرآن کی نص قطع سے ثابت ہوتی ہے اور جس پر قرآن کی یہ دو آیتیں شاہد ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ ط قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ط قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا ط فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَ سَآئَتْ مَصِیْرًا ۝ (النساء: ۹۷)

ترجمہ: بلاشبہ جن لوگوں کی فرشتے اس حال میں جان نکالتے ہیں کہ وہ اپنا برا کرتے ہوں ان سے

فرشتے کہتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے (کہ ایماں لاکر نیکوکاری نہ کر سکے) وہ کہتے ہیں کہ ہم اس ملک میں بے بس تھے فرشتے کہتے ہیں کیا خدا کی زمیں وسیع نہ تھی جہاں تم چھوڑ کر چلے جاتے۔ سو یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے لوٹنے کی۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا۝ (النساء: ۷۶)

جو لوگ ایمان دار ہیں وہ جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو لوگ کافر ہیں وہ لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں، سو تم لڑو شیطان کے حامیوں سے درحقیقت شیطان کا فریب کمزور ہے۔

اس کو اسی قومی مفاد اور مسلمانوں کے تناسب سے اور ان کے قومی تفوق کو برقرار رکھنے کے لئے جائز قرار دیا گیا اور بعض مسلمانوں ہی کی کوشش سے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

ان تمام مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک اصول وصداقت پر مفاد ومصالح مقدم ہیں۔ اخلاقی معیار اور اخلاقی حقیقتیں ان کی نگاہ میں مانع نہیں۔ اصل چیز وہ منافع اور فوائد ہیں جن کا حصول اپنی ذات خاندان یا قوم کے لئے ضروری یا فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔ یہ ذہنی کیفیت اور سیرت ایک ایسی ملت کے لئے جو پیغمبروں کی تعلیمات اور اصول کی حاملین اور اخلاق وسیرت وکردار میں تمام دنیا کے لئے نمونہ وشاہد ہے

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ: ۱۴۴)

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر۔

حد درجہ نامناسب اور غیر مطابق ہے۔ اگرچہ ایک قوم خالص ''قوم'' کے لئے بالکل مناسب اور عین مطابق ہے اور اس کا مسلمانوں کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

یہ ذہنیت وسیرت ہمارے علم میں کم سے کم ہندستان میں اس پچیس تیس برس کے عرصے میں نمایاں ہوئی ہے اور اس کو بڑا فروغ اس مغربی قوم پرستی اور موجودہ سیاسی جوش اور دفاعی جذبے نے دیا ہے جو ان پچھلے برسوں میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے ورنہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انہوں نے اصول واخلاق پر بڑے بڑے مصالح ومنافع کو ہمیشہ قربان کیا اور ایک اخلاقی اصول یا دینی حکم کی حفاظت کے لئے انہوں نے عظیم الشان سیاسی یا معاشی فوائد کو ٹھکرا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کے معاملے میں ٹھیک یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا جسے ایک خالص قوم پرست کے نقطہ نظر سے ایک بڑی سیاسی غلطی کہنا چاہیے۔ صرف ایک شرعی حکم (قصاص) اور دینی اصول (مساوات) کے قائم رکھنے کی خاطر ان کو جبلہ جیسے با اثر والئی ریاست اور غسان جیسے طاقتور قبیلہ کی امداد سے دست بردار ہونا پڑا، مگر انہوں نے اس کے لئے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جبلہ سے ہزار درجہ بڑھ کر طاقتور فرمانروا اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے غسان سے ہزار درجے بڑی ریاستیں اسلام کے اثر میں آئیں اور شریعت اسلامی میں کوئی تحریف نہیں ہو سکی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی سیاسی مصلحت کی خاطر ادنیٰ درجہ کی بھی بے اصولی اور اخلاقی معیار سے انحراف قبول نہیں کیا اور اس کے لئے وہ تمام مشکلات قبول کیں جو ان کو اپنی خلافت میں پیش آئیں مگر نظام خلافت میں کوئی تحریف نہیں ہونے دی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوئی سیاسی مصلحت اور قومی مفاد ایک ایسے نظام حکومت سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ کر سکا جو ان کے نزدیک غلط اور ان کے اعتقاد و اصول کے خلاف تھا۔

ابھی نصف صدی پہلے جب مغربی تہذیب اور مغربی افکار ہندستان میں مقبول نہیں ہوئے تھے ہندستانی مسلمانوں کا کیریکٹر اتنا مضبوط تھا کہ اعلیٰ قسم کے دینداروں کے علاوہ متوسط درجہ کے با اصول اور وضعدار شرفاء بھی جھوٹ بولنا، اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کوئی کام کرنا یا کچھ کہنا کفر سے کم نہیں سمجھتے تھے اور مر جانے کو اس پر ترجیح دیتے تھے۔ بدایوں کے ایک بزرگ (غالباً مولوی رضی اللہ صاحب) ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ماخوذ تھے۔ کلکٹر یا جج ان کا شاگرد تھا، اس نے ہزار کوشش کی کہ ایک مرتبہ مولوی صاحب اپنی زبان سے جرم کا انکار کر دیں تو ان کو صاف بری کر دے گا لیکن انہوں نے آخر وقت تک جھوٹ بولنے اور اپنے ضمیر و اعتقاد کے خلاف کچھ کہنے سے انکار کر دیا اور سزائے موت قبول کی۔

مولانا محبوب علی صاحب دہلوی نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں عام علماء کے مسلک سے کچھ اختلاف کیا بعد میں انگریزوں نے ۹ گاؤں صلہ میں دینے چاہے مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ میرا اجتہاد تھا میں نے کسی مصلحت سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

سینکڑوں ہزاروں میں سے دو مثالیں تھیں۔ شریف خاندانوں اور شرفاء کی بستیوں میں جا کر پوچھئے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ سنیں گے۔

سیرت کی صلابت، اخلاقی کی استقامت اور اصول کی پابندی کی ان مثالوں کا مقابلہ اس زمانے کی بے اصولیوں اور اخلاقی کمزوریوں، ضمیر فروشیوں اور مسلک وخیالات کی نیرنگیوں سے کیجئے تو آپ کو اس قومی انحطاط اور اخلاقی زوال کا اندازہ ہوگا جو مسلمان قوم میں نظر آرہا ہے اور روز بروز سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا وہ تاریک پہلو ہے جس کو دیکھ کر ایک حساس مسلمان کا دل خون ہوتا ہے اور وہ اس تلخ نوائی پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کے لئے اور پڑھنے والوں کے لئے کوئی خوشگوار چیز نہیں۔

مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ مردم شماری کے اعداد، ان کے قومی جوش، ظاہری تنظیم اور سرکاری عہدوں کے تناسب سے لگانا بالکل غلط ہے۔ ایک بااصول دنیا کے لئے ایک پیغام رکھنے والی اور اخلاق وسیرت میں دنیا کی تمام قوموں کے لئے معیار بننے والی امت کی پیمائش کا ہرگز یہ صحیح پیمانہ نہیں۔ ضرورت ہے کہ دیکھا جائے کہ وہ اخلاق واوصاف جو زندگی کے صحیح عناصر ہیں اور جن سے اس امت کا تشخص وامتیاز ہے وہ روبہ انحطاط ہیں یا روبہ ترقی اور اس کا اندازہ سرکاری کاغذات سے نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مسلمانوں کی عام زندگی اور ان کے اقوال وافعال سے ہوسکتا ہے۔ بقول اکبر مرحوم ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

☆☆☆☆☆

اطلاع متعلق ماہانہ پروگرام

تمام ساتھیوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ماہانہ پروگرام جو اٹھارہ دسمبر ۲۰۰۴ء کو ہونا تھا بعض ضروری وجوہات کی بناء پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب ماہانہ پروگرام بروز ہفتہ یکم جنوری ۲۰۰۵ء کو ہوگا۔ بیان انشاء اللہ تعالیٰ نماز عشاء کے بعد ہوگا اور کھانا بیان کے بعد ہوگا۔

☆☆☆☆☆